دھوپ کا چاند



سعد اللہ شاہ





خواب خیال اور افسانہ ہے سارا روپ سروپ
سب کچھ ہی جھلسا دیتی ہے آخر وقت کی دھوپ
چاندی جیسا حُسن کسی کا کیسے پڑا ہے ماند
سونے جیسے دن میں دیکھا مَیں نے دھوپ کا چاند





کبھی اس نے مجھ کو جلا دیا، کبھی اس نے مجھ کو بُجھا دیا
میں چراغ تھا تو ہوا نے بھی مجھے اک تماشہ بنا دیا

مری شکل اتری تھی خاک پر، مری خاک رکھی تھی چاک پر
میں خیالِ دستِ ہنر میں تھا، مجھے اس نے خود سے ملا دیا

فہرست

نظمیں



سعداللہ شاہ کی کتب

اردو شاعری:

بادل چاند ہوا اور میں، تمہی ملتے تو اچھا تھا، اداس موسم کے رتجگے، ہمیں اقرار کرنا تھا، اک کمی سی رہ گئی، تشنگی باقی رہے گی، مجھے کچھ اور کہنا تھا، ادھوری رات کا غم، کوئی شام شہر خراب میں، کوئی رسم بھی نہ نبھا سکا، اک وعدہ نبھانا تھا، محبت، نیلے پھولوں کی بارش میں اور دھوپ کا چاند

پنجابی شاعری:

شہر خداواں دا، وکھری چپ، ڈھلدے منظر، موسم تیرے آون نال، مکھڑا، سانوں سفنے مار گئے، ترے نال محبتاں کاہدیاں

انگریزی شاعری:

Blinking Stare

بادنما (کالم)، پرشکستہ فاختہ (نوائے وقت کے کالم)

برسے ہوئے بادل کا ٹکڑا

بادل چاند اور ہوا شروع ہی سے میری کمزوری رہے ہیں اسی باعث میرے پہلے شعری مجموعے کا نام ہی ''بادل، چاند ہوا اور میں'' تھا- بادل مجھے اڑاتے ہیں، چاند میرے ساتھ چلتا ہے اور ہوا مجھے چھو کر گزرتی ہے- ویسے تو میں تمام عناصر فطرت کا مرکز و محور ہوں لیکن مذکورہ بالا تینوں اشیاء جیسے میرے اندر سے پیدا ہوئیں- میں رویا نہیں، یہ بادل برسے، میں نے پیار کیا آنکھ میں چاند چمکا اور میں نے آہ بھری، سرد ہوا چلنے لگی- ہر شے مجھے میرے ہونے کا احساس دلاتی ہے- وہ چیز بھی کہ جو میرے گمان میں نہیں آئی، مگر خواب کی صورت مری زندگی کو رنگین کر گئی- اس کے بعد تشنگی کا ایک طویل سفر ہے جو مختلف حالات و احوال میں جاری رہا اور پھر نیلے پھولوں کی بارش تک میں نے چودہ پڑاؤ کیے، یعنی میرے چودہ شعری مجموعے اس تشنگی کا عکس ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ فطرت سے قربت بڑھتی گئی اور فطرت اپنے راز بہت دیر بعد افشا کرتی ہے-

میرا سولہواں شعری مجموعہ ''دھوپ کا چاند'' آپ کے پاس ہے- آپ کو اس نئی ترکیب پر حیرت تو ہوگی کیونکہ مجھے بھی ہوئی تھی- میرے لیے چاند کا یہ نیا روپ نئی دنیا دریافت کرنے کے مترادف تھا- یہ زوال اور ملال کا وہ لمحہ ہے جہاں چاند چاندنی نہیں

بکھیرتا بلکہ خود دھوپ کی زد میں ہوتا ہے- اس کی توجیہہ جس عمر میں سمجھ آتی ہے یہ اسی دور کی علامت بنتا ہے- یہ جوانی کا چاند نہیں جو پوری آب و تاب سے چمکتا ہے دل سمندر میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے- تاہم دھوپ کا چاند بہت مختلف ہے اسے آپ سائنسی ایجاد نہ کہیں- کم از کم ایک تخلیقی دریافت تو ہے جو سوچوں کو بدل دیتی ہے اور حقیقت کو بے نقاب کر دیتی ہے- مجھے دھوپ کا چاند کہاں سے ملا' یہ کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے-

ہر کہانی کا اپنا ہی تانا بانا ہوتا ہے جو زمان و مکان کی قید میں کسی لمحے حالات کی صورت گری کرتا ہے- بقول ٹی ایس ایلیٹ ہر لمحے کے ساتھ کئی لمحے جڑے ہوتے ہیں- یہی لمحے واقعے یا حادثہ کو گرفت میں لے کر کہانی بناتے ہیں- میں بھی لمحوں کو چٹکتے ہوئے غنچوں کی صورت' اڑتی ہوئی تتلیوں کی طرح اور ہمکتے ہوئے بچوں کے روپ میں دیکھتا ہوں تو سرشار ہو جاتا ہوں- پھول' تتلی اور بچہ مجھے ویسے بھی ہانٹ کرتے ہیں- پھول کی خوشبو فضا مہکاتی ہے' تتلی پھول کو رنگوں کا لمس دیتی ہے اور بچہ تتلی پکڑنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے- پھول خوشبو کو دست صبا کی نذر کر کے بکھر جاتا ہے- تتلی صبح کو رنگین بنا کر گم ہو جاتی ہے اور بچہ ان مناظر کو آنکھوں میں سجا کر بڑا ہو جاتا ہے اور آنکھیں اس کے بڑا ہوتے ہی بدل جاتی ہیں-

بچپن اک خواب ہی تو ہے- شاید یہ اسی لیے خوبصورت ہے- یہ سپنا ایک وقت پر آ کر ٹوٹتا ہے تو زندگی کی تلخ حقیقتیں سامنے آتی ہیں- اسی لیے سپنے کی عمر کا دور سنہری کہلاتا ہے- یہی خوابیدہ دور حسین ترین دور ہے- خوبصورت یادیں اس دور کی تعبیر ہیں- خوش قسمت ہے وہ جسے یہ خواب یاد رہے- سب سے بڑا ظالم ہے جو اس خواب کی تعبیر نہیں ہونے دیتا- کبھی کبھی عراق میں پانچ لاکھ خوابوں کے ٹوٹنے کا دکھ مجھے

خون کے آنسو رلاتا ہے- انسانیت سوز غارت گری کے زمرے میں آنے والا یہ عمل افغانستان میں بھی جاری ہے- یہ انسان کا گھناؤنا روپ ہے کہ وہ اپنے بچپن کو بھی بھول گیا' بچوں سے خواب دیکھنے کا عمل چھیننے لگا اور بربریت کے باوجود مہذب کہلایا

شاعری فطرت سے ہم آہنگ ہونے کا نام ہے' انہی خوابوں کو ٹوٹنے سے بچانے کا اور تعبیر کی تمنا کرنے کا عمل ہے- فطرت سب سے بڑا مرہم ہے- میں اس کا مشاہدہ کرنے میں ایک گونہ آسودگی محسوس کرتا ہوں- میں نے اپنے شعری مجموعے ''نیلے پھولوں کی بارش میں'' کے دیباچہ میں اسی مشاہدے کے حوالے سے لکھا تھا کہ میرے گھر کے سامنے نیلے پھولوں سے لدا درخت جب نیلے پھولوں کی بارش کرتا ہے تو وہ عبادت میں مشغول نظر آتا ہے- اس کے نیچے اس کے پھیلاؤ کے برابر نیلا قالین بچھ جاتا ہے- دوست میرا دیباچہ پڑھ کر اس درخت کو دیکھنے آئے' سعدیہ سیٹھی نے مجھے یو کے سے بتایا کہ وہاں بھی ایک پنک (Pink) پھولوں کی بارش برسانے والا ایک درخت جسے دیکھنے کے لیے وہ باقاعدہ اس موسم کا انتظار کرتی ہے- امیر نواز خاں نیازی نوائے وقت میں اس شعری مجموعے پر کالم لکھتے ہوئے اس درخت کا نام یوگرنڈا بتایا- کیونکہ مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا اور میں نے لکھا تھا ''حسن ہے تو حسن کو بے نام دیکھا چاہیے'' جب منظر مشاہدے کا حصہ بنتا ہے تو اس میں بہت سے لوگوں کی سانجھ پڑ جاتی ہے-

یقیناً ''دھوپ کا چاند'' بھی بہت سے لوگوں نے دیکھا ہوگا- میں نے خود اسے کئی مرتبہ دیکھا تھا لیکن یہ چاند میں نے براہ راست نہیں دیکھا بلکہ اپنے بیٹے کی آنکھ سے دیکھا- میری عادت ہے کہ میں صبح سویرے اٹھتا ہوں اور پھر نماز کے بعد کبھی کبھی

سیر کے لیے نکل جاتا ہوں- چونکہ میرا چھوٹا بیٹا زبیر بھی شب بیدار قسم کا ہے اور وہ بھی میرے ساتھ ہی چلا جاتا ہے- فطرت کی آغوش میں بچے کی حیرت اور خوشی دیکھنے کی چیز ہے- میں بھی اپنے بیٹے کی حرکات وسکنات سے بہت محظوظ ہوتا ہوں- چڑیا' فاختہ' ہُدہُد اور گلہری کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اک عجیب سی چمک آ جاتی ہے- وہ ہُدہُد کو پکڑنے کے لیے بھاگتا ہے اور ساتھ ہی توتلی زبان میں کہتا جاتا ہے'' تکو تکو (رکو رکو)- جب وہ اڑ جاتی ہے تو غصے سے آنکھیں اوپر چڑھا کر کہتا ہے ''گندی بچی''- بچے کی معصومیت بھی کمال کی ہوتی ہے- زبیر کوّے کو پکڑنے کی بھی کوشش کرتا ہے اور کوّا اسے کافی قریب آنے دیتا ہے اور پھر پُھدک کر آگے بڑھ جاتا ہے- یہ بڑا چالاک جانور ہے-

مجھے یہ سب کچھ شاعری لگتا ہے- سیر کرتے ہوئے کبھی کبھی صابر لودھی اور فرخندہ لودھی سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے- وہ میرے پڑوس میں رہتے ہیں- وہ ہمیں دیکھ کر دور ہی سے مسکرانے لگتے ہیں اور قریب آ کر زبیر کو پیار کرتے ہیں- غالباً فرخندہ لودھی بھی اپنی کسی کہانی کا پلاٹ ڈھونڈنے گھر سے نکلتی ہوں گی-

میں تو سچ مچ شاعری کے لیے لمحے باہر سے چُنتا ہوں اور پھر ان گرے ہوئے لمحوں کو وقت کے ساتھ جوڑ کر دیکھتا ہوں اور یہ سمجھتا بھی ہوں کہ ٹوٹے ہوئے پتوں کو درخت کے ساتھ دوبارہ جوڑا نہیں جا سکتا- مگر اس تمنا سے درختوں پر نئی کونپلیں ضرور نکل آتی ہیں- ایسے ہی ایک موسم میں میں اپنے بیٹے کو گود میں لے کر گھر کے سامنے والے پارک میں بیٹھا تھا- نیلے پھولوں والا درخت خاموش کھڑا اس موسم کا انتظار کر رہا تھا' جب فطرت اسے گہنے پہناتی ہے- ہوا میں کچھ خنکی تھی- اِکا دُکا پرندے ادھر

ادھر پُھدک رہے تھے- اک بے نام سی اُداسی ماحول کا حصہ بنی ہوئی تھی- میرے بیٹے نے اپنے ننھے منے ہاتھ سے میرے منہ کو آسمان کی جانب موڑتے ہوئے کہا'' وہ دیکھو دھوپ کا چاند''

میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو چاند برستے ہوئے بادل کے ٹکڑے کی طرح بے نور نظر آ رہا تھا- اگرچہ میں نے اسے پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھا تھا مگر اب کے یہ مجھے اپنا ہی استعارا لگا- مجھے وہ چاند یاد آیا جو رات کو چاندنی بکھیرتا تھا جو چندا ماموں ہوا کرتا تھا- وہ چاند جو میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا تھا' جو بادل اوڑھتا تو اور بھی حسین ہو جاتا- انسان کے چاند پر پہنچنے سے پہلے وہ ایک خوبصورت سپنا تھا- انسان نے اس پر قدم رکھا تو وہ پتھر کا ہو گیا- اس پر چرخہ کاتتی بڑھیا ایک بہت بڑی کھائی میں دفن ہو گئی- میں دیر تک سوچتا رہا کہ اب میرے چاند کو سورج کا سامنا ہے- مجھے دن گزارنا ہے اور گزارنا بھی مشقت میں ہے تاکہ میرے بچے کے دن ابھی رات کا چاند دیکھنے کے ہیں-

بچہ بہت خوش قسمت ہوتا ہے کہ اسے دھوپ کے چاند کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی- وہ تو بقول ورڈز ورتھ یہ بھی نہیں جانتا کہ زندگی اور موت کے درمیان امتیاز کیسے کیا جاتا ہے- وہ قبروں پر بیٹھ کر بھی مرنے والوں سے باتیں کرتا ہے- وہ شعور کی منزل تک وہی کچھ سچ سمجھتا ہے جو کچھ اسے پڑھایا جاتا ہے- اسے پڑھایا جاتا ہے کہ امریکہ ترقی یافتہ اور مہذب ملک ہے' وہ انسانی آزادی اور حقوقِ فرد کا علمبردار ہے- اسے بتایا جاتا ہے کہ سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ دنیا میں امن و امان قائم کرنے اور انصاف فراہم کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں- اسے یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مصطفیٰ کمال

پاشا مسلمانوں کا ہیرو تھا اور یہ بات باقاعدہ اس کے سلیبس میں رکھی جاتی ہے۔ جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اسے ''دھوپ کا چاند'' اپنے نئے معانی میں نظر آتا ہے۔ اسے پتہ چلتا ہے کہ آزادی مانگنا تو دہشت گردی ہے اور ظلم کو ظلم کہنا بغاوت۔

بچہ بڑا ہو کر کچھ زیادہ ہی باغی ہو جاتا ہے۔ وہ خدا سے سوال کرتا ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کیوں کھا جاتی ہے۔ ظالم لوگوں کو مظلوم کیوں بناتا ہے۔ طاقتور مہذب اور کمزور بدتہذیب کیوں کہلاتا ہے۔ اس دنیا میں کمزور کو جینے کا کیوں حق نہیں۔ پھول تتلیاں اور بچے بارود کے ساتھ کیوں بھسم کیے جاتے ہیں۔ خوشبو اور صبا میں زہریلی گیس کیوں شامل ہو جاتی ہے۔ پتہ نہیں بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ جب غم زیادہ ہو تو سوچیں منتشر ہو جاتی ہیں اور خدا سے بھی شکوہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں کہ جس معاشرے میں کیٹس جیسا شاعر پیدا ہوا کہ جو کہتا تھا:

Truth is beauty and beauty is truth

اگر زندہ ہوتا تو امریکہ کے اس بیان پر بھی ضرور کچھ کہتا کہ جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ امریکہ دنیا کو تین مرتبہ تباہ کر سکتا ہے۔ خیر جو بھی ہے، اہل فن کو امن اور محبت کے پھول کھلانے ہیں کہ شاید یہیں سے تعمیر شروع ہو۔

سعد اللہ شاہ

۱۸۱۔ ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون گھر: 5411005

فون آفس: 7122943

غزلیں

دریا بھی سامنے تھا مکمل کٹاؤ پر
اور زندگی رواں تھی محبت کی ناؤ پر

کیسے زمیں کی قید سے کوئی نکل سکے
ہر سمت آسمان ہے پورے جھکاؤ پر



اے ربِّ کعبہ ہمیں دور تک رسائی دے
کہ جان و مال سے باہر بھی کچھ دکھائی دے

محاصرے میں ہیں بیٹھے ہم اپنے دشمن کے
محافظوں سے ہمیں کون اب رہائی دے

بنام اپنے تو افغانیوں کا حال تو دیکھ
اب اس قدر بھی نہ دجّال کو خدائی دے

اندھیرا چھایا ہے، ہر سُو لہو لہو ہے سحر
دلوں کو امن و محبت سے آشنائی دے

ہمارے پھول سے بچے ہیں آگ کی زد میں
یہ خلق تیری کہاں تک تری دہائی دے

گناہگار ہیں لیکن ہیں تیرے بندوں میں
کہ دھڑکنوں میں ترا نام ہی سنائی دے

عطا ہو مولا ہمیں حوصلہ بھی عزم کے ساتھ
ہمیں تو اپنے ہی در کی فقط گدائی دے



ازل ابد ہے فقط روشنی محمدؐ کی
ہے شمعِ راہِ وفا زندگی محمدؐ کی

اسی کے نام سے حاصل ہوا دلوں کو گداز
خوشا کہ جس کو ملی دوستی محمدؐ کی

زمانے بھر کا ہے سلطان فقر و فاقہ میں
سراپا عجز رہی عاجزی محمدؐ کی

زمانے بھر کے بکھیڑوں سے کر دیا آزاد
ہمارے سامنے ہے سادگی محمدؐ کی

وہ کامران ہوا کامیاب ہوا
نصیب جس کو ہوئی پیروی محمدؐ کی

وہی ہے راہِ محبت، وہی ہے راہِ نجات
کہ رہنمائی جہاں بھی ملی محمدؐ کی

خوشی سے بھر گیا دل اور آنکھیں بھیگ گئیں
اے سعدؔ جب بھی کبھی چاہ کی محمدؐ کی



پھول خوشبو کے نشے ہی میں بکھر جاتے ہیں
لوگ پہچان بناتے ہوئے مر جاتے ہیں

منزلیں ان کا مقدر کہ طلب ہو جن کو
بے طلب لوگ تو منزل سے گزر جاتے ہیں

جن کی آنکھوں میں ہوں آنسو انہیں زندہ سمجھو
پانی مرتا ہے تو دریا بھی اُتر جاتے ہیں

ہم ہواؤں میں بھی جلتے ہیں چراغوں کی طرح
اور آنکھیں بھی کسی راہ میں دھر جاتے ہیں

نیچی پرواز میں اڑنا نہیں آتا ہم کو
اونچا اڑتے ہیں تو اس جسم سے پَر جاتے ہیں

کوئی ہوتا ہے کہیں کام بنانے والا
اک بگڑتا ہے تو سو کام سنور جاتے ہیں

حیلہ سازی میں نہ یوں وقت گنواؤ اپنا
کام کرنا ہو جنہیں سعدؔ وہ کر جاتے ہیں



باغ میں اگ رہا ہے جنگل بھی
بات ادھوری ہے اور مکمل بھی

اور کیا مانگتے ہو تم، ہم سے!
لوگ کہتے ہیں ہم کو پاگل بھی

ملتا جلتا ہے چاند سے کتنا
وہ جو رہتا ہے کچھ کچھ اوجھل بھی

وہ تو پہلے بھی خوبصورت تھا
اب کے اوڑھا ہے اس نے بادل بھی

جھیل آنکھوں میں تیرتے تھے کنول
"بات کرتا تھا کیسے کاجل بھی"

چاند نکلے تو پھر سمندر میں
پیدا ہوتی ہے کچھ تو ہل چل بھی



وصال لمحے بہت خوشگوار آئے ہیں
برنگِ بوئے گلِ نو بہار آئے ہیں

صدا پہ اپنی وہ برہم ہیں اس طرح جیسے
ہم ابرِ برق و شرر کو پکار آئے ہیں

طلسمِ ہوشربا تھا جمالِ حسنِ کمال
ہم ایک لمحے میں صدیاں گزار آئے ہیں

یہ آب و گل کا تموّج یہ رنگ و بُو کی بہار
ہم اختیار میں بے اختیار آئے ہیں

خیال و خواب کے چلمن اور آرزو کے چراغ
یہ جھلملاتے سمے شعلہ بار آئے ہیں

ہیں جامِ مے سے بھی بڑھ کر یہ شبنمی غنچے
جو بامِ اوج پہ ہم کو اُتار آئے ہیں

ہمیں تو سعدؔ جی بے چینیوں نے مارا ہے
کہ دے کے دل بھی تو ہم بے قرار آئے ہیں



آج بیٹھے ہیں رہگزار میں ہم
کاش دیکھو کہ ہیں غبار میں ہم

تیرا آنا خزاں کا جانا ہے
کِھل اٹھے ہیں اسی بہار میں ہم

ہم نے کھینچا تھا دائرہ تجھ پر
آ گئے خود ہی اس حصار میں ہم

مار ڈالے گی یہ اَنا ہم کو
ٹوٹ جائیں گے اک خمار میں ہم

کیا بتائیں کہ ہجر کیسا ہے
نقشِ صورت ہیں انتظار میں ہم

اک ستارا ہے چشمِ روشن میں
گھومتے ہیں کسی مدار میں ہم

سعدؔ اس کو ہزار ہم جیسے
خود ہی سوچو ہیں کس شمار میں ہم



اب نظر آتی نہیں چہروں پہ حیرانی بھی
کیسے آباد ہوئی شہروں میں ویرانی بھی

مجھ میں تھوڑی سی یہ بو باس بھرم ہے تیرا
ورنہ مانوس ہے تجھ سے ترا زندانی بھی

سانس آتے ہی چلی جاتی ہے بے بس کر کے
زندگی موت ہے اور موت سے بیگانی بھی

ہم بھی کیا ہیں کہ بھرے پھرتے ہیں بادل کی طرح
اور آنکھوں سے چھلک جاتا ہے جب پانی بھی

کتنے دن اور میسر ہیں خوشی کے لمحے
اپنی خوشیوں میں ہے شامل یہ پریشانی بھی

آگ ہی آگ ہے دیکھو تو محبت اپنی
مار ڈالے نہ یہ جذبوں کی فراوانی بھی

روز اک توبہ ہے، اور روز نیا وعدہ ہے
اک ندامت کے سوا کیا ہے یہ نادانی بھی

زندگی سعد بصارت سے بصیرت تک ہے
سہل اتنی ہے کہاں اپنی نگہبانی بھی





یہ جو پر شکستہ ہے فاختہ یہ جو زخم زخم گلاب ہے
یہ ہے داستاں مرے عہد کی جہاں ظلمتوں کا نصاب ہے

جہاں ترجمانی ہو جھوٹ کی جہاں حکمرانی ہو لوٹ کی
جہاں بات کرنا محال ہو وہاں آگہی بھی عذاب ہے

مری جان ہونٹ تو کھول تو کبھی اپنے حق میں بھی بول تو
یہ عجیب ہے تری خامشی نہ سوال ہے نہ جواب ہے

سرِ رہ چراغ جلے گا کیا کوئی منزلوں کو چلے گا کیا
ترا دل ابھی ہے بجھا ہوا تری آنکھ میں ابھی خواب ہے

وہی آب آب ہیں آبلے، وہی فصل فصل ہیں فاصلے
وہی خار خار ہے رہگزر، وہی دشت دشت سراب ہے

وہی بام و در ہیں جلے ہوئے، وہی چاند چہرے ڈھلے ہوئے
وہی صبحِ کوئے ملال ہے، وہی شام شہر خراب ہے

مجھے سعدؔ تجھ سے گِلہ نہیں، کہ میں خود ہی تجھ سے ملا نہیں
مری زندگی بھی عذاب ہے، تری زندگی بھی عذاب ہے



یہ جمال کیا، یہ جلال کیا، یہ عروج کیا، یہ زوال کیا
وہ جو پیڑ جڑ سے اکھڑ گیا اسے موسموں کا ملال کیا

وہ جو لمحہ لمحہ بکھر گیا، وہ جو اپنی حد سے گزر گیا
اسے فکرِ شام و سحر ہو کیا، اسے رنجشِ مہ و سال کیا

وہ جو بے نیاز سا ہو گیا، وہ جو ایک راز سا ہو گیا
جسے کچھ غرض ہی نہیں رہی اسے دستِ حرفِ سوال کیا

ہوا ریزہ ریزہ جو دل ترا اسے جوڑ جوڑ کے مت دکھا
وہ جو اپنے حسن میں مست ہے اسے آئنے کا خیال کیا

وہی ہجر رات کی بات ہے وہی چاند تاروں کا ساتھ ہے
جو فراق سے ہوا آشنا اسے آرزوئے وصال کیا

کسی اور سے کریں کیوں گلہ، ہمیں اپنے آپ سے دکھ ملا
وہ جو دردِ دل سے ہو آشنا اسے دنیا بھر کا وبال کیا

وہی گرد گرد غبار ہے، وہی چاروں اور فشار ہے
وہ جو خود کو بھی نہیں جانتا وہ ہو میرا واقفِ حال کیا

اسے سعدؔ کیسا بتائیں ہم اسے کس سے جا کے ملائیں ہم
وہ تو خود سراپا مثال ہے یہ گلاب کیا یہ غزال کیا



سارے کردار غزل میں ہیں فسانے والے
اور کچھ بات بڑھاتے ہیں بڑھانے والے

اب نہیں لوگ بھی ایسے کہ سنیں درد مرا
اور ہم بھی تو نہیں یونہی سنانے والے

ہم انہیں ڈھونڈنے نکلے ہیں تو خود بھٹکے ہیں
گم ہوئے آپ ہمیں راہ دکھانے والے

بات چھپتی ہے تو کچھ اور عیاں ہوتی ہے
کب سمجھتے ہیں مگر پیار چھپانے والے

مت سلگتے ہوئے لوگوں کو ہوا دو ایسے
خود بھی جل جائیں نہ یوں ہم کو جلانے والے

ان کو حیرت ہے کہ ہم روتے ہیں کیونکر آخر
آشنا غم سے نہیں ہنسنے ہنسانے والے

پھول بھی کھلتے ہوئے روتے ہیں شبنم شبنم
کیونکہ خوشبو کے سبھی جھونکے ہیں جانے والے

پھول زخمی ہیں تو کانٹوں سے لہو ٹپکے ہے
سرخرو سعدؔ ہوئے ناز اٹھانے والے



اپنا مسکن مری آنکھوں میں بنانے والے
خواب ہو جاتے ہیں اس شہر میں آنے والے

بات کچھ بھی نہیں بس اپنا مزاج ایسا ہے
ہم تری بزم میں واپس نہیں آنے والے

شکریہ تیرا کہ تو نے ہمیں زندہ رکھا
ہم کو محرومی کا احساس دلانے والے

ہم کو فرصت ہی نہ دی شام و سحر نے اپنے
ورنہ کتنے تھے شب و روز منانے والے

ٹھیک کہتے ہو مری بات گراں ہے تم پر
سونے والوں کو برے ہیں یہ جگانے والے

اپنی ناکامی پہ پچھتاوا نہیں ہے ہم کو
ساتھ چلتے ہیں زمانے کے زمانے والے

ان کے ہوتے ہوئے کچھ بھی نہیں دیکھا جاتا
کتنے روشن ہیں چراغوں کو جلانے والے



کبھی اس نے مجھ کو جلا دیا، کبھی اس نے مجھ کو بجھا دیا
میں چراغ تھا تو ہوا نے بھی مجھے اک تماشہ بنا دیا

مری شکل اتری تھی خاک پر، مری خاک رکھی تھی چاک پر
میں خیالِ دستِ ہنر میں تھا، مجھے اس نے خود سے ملا دیا

مری آنکھ میں جو سما گیا سرِ آب نقش بنا گیا
کہاں چاند باقی رہے گا پھر جو کسی نے پانی ہلا دیا

میں خلا میں ہوں، میں سزا میں ہوں، کہ میں اب بھی اپنی انا میں ہوں
جسے یہ زمیں نہ پکڑ سکی اسے آسماں نے گرا دیا

رہا بے خبر میں تو عمر بھر کہ رہا کسی کے مزاج پر
کبھی اس نے مجھ کو ہنسا دیا کبھی اس نے مجھ کو رُلا دیا

کوئی پھول جبکہ کِھلا نہ تھا کوئی درد جبکہ مِلا نہ تھا
مرے دل سے غم کی ہواؤں نے ترا نام و نقش مٹا دیا

تری بات تھی مری ذات تھی مرے پاس چاندنی رات تھی
اسی لطفِ خانہ خراب نے سرِ شام مجھ کو سُلا دیا

یہ کہانیاں یہ نشانیاں یہ تمہاری اشک فشانیاں
مرے سعدؔ تم کو یہ کیا ہوا ترا چین کس نے گنوا دیا



اداسیوں کے سائے ہیں شجر شجر
بھٹک رہے ہیں راہرو اِدھر اُدھر

میں جانتا ہوں منزلیں ہیں دور ابھی
ابھی تو ساتھ چل رہی ہے رہگزر

مرے گمان میں نہ تھا یہ حادثہ
کہ بات پھیل جائے گی نگر نگر

ہماری سوچ کیسے پہنچی اس کے پاس
دلوں سے جاتی ہے دلوں کو ہر خبر

ہماری بات موج ہے بہار کی
نمو پذیر اس میں ہے کوئی اثر

برس گئے جو ابر تو کھلا سماں
نئے افق پہ کھو گئی مری نظر

سجا ہوا ہے سعد اب خیال بھی
ستارہ وار نکلا ہے کہیں قمر



کیوں برا کہتے ہو تم اپنے جفا کاروں کو
آج تک کوئی نہیں سمجھا وفاداروں کو

وہ جو بے چینی سے نکلے تو اداسی میں گھرے
اک مصیبت ہے پڑی تیرے سزاواروں کو

ہم کسی پہلو بھی ناراض نہیں ہیں تجھ سے
داد ملتی ہے اداؤں پہ اداکاروں کو

تم تو عادی ہو بہت درد کی اس دنیا کے
کرنا پڑتا ہے یہ ماتم بھی عزاداروں کو

تو تو بندہ ہے فقط اور ہے مجبورِ محض
بخش دیتا ہے خدا اپنے گنہگاروں کو

کڑھتے رہتے ہیں مگر دل کی نہیں کہہ سکتے
کیسے ملتی ہے سزا خود ہی ریاکاروں کو

سعدؔ بے لوث محبت کا صلہ کیا معنی
کام سے اپنے فقط کام رضاکاروں کو

سعدؔ ہم اس کے ہر اک جھوٹ کو سچا سمجھے
روکتا کون ہے باتوں میں بھلا یاروں کو



رکھ کے کیا کیا گمان جاتے ہیں
وہ جو صحرا کو چھان جاتے ہیں

راز چھپتا نہیں ہے دل میں کبھی
لوگ آنکھوں سے جان جاتے ہیں

کیا ضروری ہے ضد پہ اڑ جانا
لوگ لوگوں کی مان جاتے ہیں

اس کا کچھ پاس بھی تو رکھتے ہیں
وہ جو دے کر زبان جاتے ہیں

جب بھی آتے ہیں آنکھ میں بادل
سائباں سا وہ تان جاتے ہیں

سعدؔ دل پر جو زخم لگتے ہیں
کہاں ان کے نشان جاتے ہیں



کیا درد میں لذت تھی کیا رات سہانی تھی
اک چاند کے چہرے پر بادل کی کہانی تھی

ہم گھومتے رہتے تھے مخمور فضاؤں میں
تنہائی کی راتوں میں اک رات کی رانی تھی

اندھی تھی ہر اک خواہش گونگا تھا ہر اک جذبہ
موسم تھا بہاروں کا ہر رنگ جوانی تھی

سودائے محبت میں آوارگی قسمت تھی
ہم دشت نوردوں کو کچھ خاک اڑانی تھی

کچھ وہ بھی تھا ضدی سا کچھ ہم بھی انا والے
ہم جیت نہ پائے اور ہار اس نے نہ مانی تھی

ہم پھول اگاتے تھے اور کانٹے بھی چنتے تھے
توقیرِ گلستاں بھی ہم ہی کو بچانی تھی

توسن پہ تخیل کے اڑتے رہے دیوانے
ہر چیز میں جدت تھی، ہر سوچ پرانی تھی

ہم چاہتے تھے اس کو اور اس کا نہ پوچھو کچھ
آزار پسندی تو سعدؔ اپنی نشانی تھی



اپنی باہوں ہی سے بنیاد اٹھا لی جائے
یادگار ایک تو سینے پہ بنا لی جائے

کھول دو روزن و در آئے کرن سورج کی
دل کی صورت تو کسی طرح اُجالی جائے

میرؔ کی بات بھی سچ ہے مگر اے جاں پھر بھی
عشق میں عزتِ سادات بچا لی جائے

زندگی کیسے گزاریں گے بھلا دل کے بغیر
ایسی شے تو نہ سرِ راہ گنوا لی جائے

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھنا کیوں کر
اپنی تقدیر نہ کیوں خود ہی بنا لی جائے

ایک دریا جو ہوا خشک تو لوگوں نے کہا
لبِ دریا کوئی بستی ہی بسا لی جائے



تنہائیوں سے خود کو بچانا پڑا مجھے
یادوں کا ایک شہر بسانا پڑا مجھے

مجھ کو نظر نہ آتا تھا اپنے سوا کوئی
خود اپنا نقش آپ مٹانا پڑا مجھے

دیکھا اسے تو جاگ اٹھیں ساری لذتیں
پھر شوقِ بے بہا کو سلانا پڑا مجھے

ہر بار بات بن نہ سکی اس کے سامنے
ہر بار اک بہانہ بنانا پڑا مجھے

کاٹی ہے میں نے رات بھی ایسے سحر تلک
پل پل جگر کا خون جلانا پڑا مجھے

بچپن کی یاد نے مجھے مجبور کر دیا
کاغذ کی کشتیوں کو بہانا پڑا مجھے

اے سعدؔ رات بھی تو کٹی آنکھ میں مرے
اور ایک زرد دن بھی بتانا پڑا مجھے

ہر گام اک عذاب تھا یہ حسنِ بے حساب
خود کو کسی حساب میں لانا پڑا مجھے



محبتوں میں جو ہوتا ہے وہ تو ہونا تھا
کہ جاگنا تھا مقدر میں اور نہ سونا تھا

ہنسی ہنسی میں کسی کو بنا لیا اپنا
کسے خبر تھی کہ یہ عمر بھر کا رونا تھا

گرے ہیں ضبط کے آنسو جو میرے سینے میں
سوادِ دل کو انہی پانیوں نے دھونا تھا

بس اتنی بات سمجھ میں نہ آ سکی اپنے
کہ کاٹنا تھا وہی کچھ جو ہم نے بونا تھا

یہ دست و پا تو مرے ذہن کی کمان میں ہیں
وگرنہ دل کے لیے تو میں اک کھلونا تھا

یہ کشمکش ہی رہی عمر بھر محبت میں
کسی کو اپنا بنانا' کسی کو کھونا تھا

کوئی نہیں ہے جو ساتھی ہو زندگی بھر کا
یہ بوجھ سعدؔ اکیلے ہی ہم کو ڈھونا تھا



جمع کرنا کوئی آسان ہے دل پاروں کو!
ٹوٹا جام کا چبھتا بھی ہے مے خواروں کو

سونے والوں سے کوئی پوچھے گا رستہ کیونکر
یہ فریضہ تو ادا کرنا ہے بیداروں کو

چاند کی سمت اچھلتا ہے سمندر دیکھو
آسماں تھامتا ہے ٹوٹے ہوئے تاروں کو

کون سی شے ہے جو محصور نہیں ہو پاتی
تم گھماؤ تو سہی وقت کے پرکاروں کو

قفسِ دل نہ کھلا اونچی اڑانوں میں بھی
یہ رہائی تو سزا تھی ترے لاچاروں کو

ہم کہ رونے سے بھی کچھ اور بھڑک اٹھے ہیں
سعدؔ پانی تو بجھا دیتا ہے انگاروں کو



مجھ سے کچھ دور ہی رکھو مرے دلداروں کو
کیسے پیوست کروں سینے میں تلواروں کو

یاں تو ناکردہ گناہوں کی تلافی بھی نہیں
اور کوئی پوچھنے والا بھی نہیں یاروں کو

اس تماشے میں تو اب دوش کسی کا بھی نہیں
خود کہانی نے سمیٹا نہیں کرداروں کو

تند موجیں تھیں، چٹانیں تھیں، مری کشتی تھی
جانے کب توڑ دیا پانی نے پتواروں کو

اے مری آنکھ! کوئی اشک نہ گرنے پائے
کچھ بھی تکلیف نہ پہنچے مرے غمخواروں کو

اپنی گفتار سے وہ پھول کھلانا اس کا
اور پھر داد طلب دیکھنا بیزاروں کو



کیسے الجھے ہیں خواہشات میں ہم
آن بیٹھے ہیں اپنی گھات میں ہم

اپنی تکمیل چاہتے ہیں فقط
نامکمل ہیں اپنی ذات میں ہم

ایک امید پر چراغ بدست
جلتے جاتے ہیں کالی رات میں ہم

اس کا ملنا بھی حادثہ ٹھہرا
گھرتے جاتے ہیں حادثات میں ہم

یاد، سپنا، خیال، سوچ اور وہ
کب اکیلے ہیں کائنات میں ہم

سعدؔ ہم پر غزل اترتی ہے
فاعلن میں نہ فاعلات میں ہم



ایک صورت ہیں صاعقات میں ہم
کیوں پڑیں اب توہمات میں ہم

کتنا کمزور ہے یہ دل اپنا
مر ہی جاتے ہیں سانحات میں ہم

لوگ تو ایسے بات کرتے ہیں
جیسے شامل ہیں واردات میں ہم

گل کھلاتا ہے دیکھیے کیا کیا
خود کو رکھتے ہیں دل کے ہات میں ہم

لفظ دل پر پڑے تو اشک بنے
درد رکھتے ہیں اپنی بات میں ہم

وہ جو صورت نمو کی پھول میں ہے
دیکھ لیتے ہیں اس کو پات میں ہم

سعدؔ اپنا خدا ہی حافظ ہے
مر نہ جائیں توقعات میں ہم



وہ اگر راستہ بدل جاتا
ایک خطرہ تو سر سے ٹل جاتا

اس کا جانا ٹھہر چکا تھا اگر
حرج کیا تھا پتہ جو چل جاتا

رنگ جتنے تھے میری آنکھوں میں
کاش چہرے پہ اسکے مل جاتا

اک نشانی تو رہتی ہاتھوں پر
وہ کوئی پھول ہی مسل جاتا

کھاد بنتا وہ پھول پھل کے لیے
ایک پتہ جو گر کے گل جاتا

وہ کہ تنہا نہ ہو سکا تھا کبھی
ورنہ کب ہی کا پھول پھل جاتا

ہم ہی گزرے نظر بچا کر سعدؔ
خوف وہ تھا کہ دل دہل جاتا



اس کی خواہش میں گر میں ڈھل جاتا
میں کھلونوں ہی سے بہل جاتا

پیرہن اس کا کاغذی نکلا
ورنہ میں تو کبھی کا جل جاتا

اک تمنا تو پھر بھی رہنا تھی
یہ بھی موسم اگر بدل جاتا

ساحلوں کا ٹھکانا کیا ہوتا
وہ سمندر اگر مچل جاتا

میں اگر بات بھی نہ کر پاتا
میرے سینے سے دم نکل جاتا

وہ ستائش پسند بھی تو نہیں
کیسے سن کر مری غزل جاتا

اس میں حیرانگی کی بات ہے کیا
ایک سورج کہیں بھی ڈھل جاتا

سعدؔ مارا مجھے سہاروں نے
ورنہ کب ہی کا میں سنبھل جاتا



ہمارا کیا کہ بنے ہیں خود اپنے ہی دشمن
لگا دیا ہے محبت کے داؤ پر تن من

ہمارا چاند بدلتا ہے اک نیا چہرا
کوئی بتائے کہ لاؤں کہاں سے میں بچپن

جو بات کہنا تھی وہ تو کہی نہیں ہم نے
ہمارے کام نہ آئی ہماری مشقِ سخن

مصاحبت ہی کسی کی، اثر دکھاتی ہے
جو خار میں تھی وہی پھول میں ملی ہے چبھن

میں صبح و شام رہا ہوں تلاش میں اپنی
وگرنہ مار ہی دیتی مجھے کسی کی لگن

میں زندگی سے نمٹتا ہوں دونوں ہاتھوں سے
میں اپنی ذات میں رہتا نہیں ہمیشہ مگن



دل نے آنکھوں کو رہنِ خواب کیا
کیسے جینا مرا عذاب کیا

خود ہی آنکھوں سے دل تک آیا وہ
کب اسے ہم نے انتخاب کیا

اس کے آنچل کا رنگ کیا کہیے
جس نے دو آتشہ گلاب کیا

نام اس کا کہیں نہیں ہے مگر
نام اس کے ہر انتساب کیا

یہ زمیں آسماں نہیں لیکن
ہم نے جگنو کو ماہتاب کیا

کون کہتا ہے بھٹکے ہیں رستہ
ہم نے خود اس کو بے حجاب کیا

سعدؔ ممکن تھا بات بن جاتی
کام جلدی ہی میں خراب کیا



تھام کر دل کو سنبھلنا میرا
اس کی محفل سے نکلنا میرا

شمع رو اس کا پگھلنا مجھ میں
سر بسر اس میں وہ جلنا میرا

چاندنی اوڑھ کے آنا اس کا
شبِ مہتاب میں ڈھلنا میرا

کون کھیلے گا فقط ہارنے کو
اک اُلٹ چال وہ چلنا میرا

برف چوٹی پہ چمکتا سورج
کون دیکھے گا پگھلنا میرا

اف لڑکپن کا زمانہ توبہ
دیکھ کر چاند مچلنا میرا

سعدؔ بے وجہ کسی خوف کے ساتھ
یک بیک گھر سے نکلنا میرا



عجیب اک طلسم ہے حیات میں
جو موت کی طرح چھپا ہے ذات میں

مرے سخن کی سادگی تو دیکھنا
اُلجھ کے لوگ رہ گئے ہیں بات میں

حقیقتوں میں ڈھل رہے ہیں وہم بھی
کہ چل رہے ہیں سائے اپنی گھات میں

تھی جیت میں شکستہ دل فسردگی
مگر جو لطف سا ملا ہے مات میں

بجھا دیے کسی نے جب سبھی دیے
ستارے لے کے چاند اترا رات میں

جو ٹوٹ کر گرا تو پھر نہیں جڑا
عجیب اک انا تھی ٹوٹے پات میں

مہک رہا ہے ایک لمحہ آج تک
کہ پھول پکڑے رہ گیا میں ہات میں



چھٹی ہے تیرگی کتنی چراغوں کو جلانے سے
دُھلے ہیں داغ سینوں کے ان اشکوں کو بہانے سے

طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ ہم نے روگ خود پالے
شکایت ہے کسی سے اب نہ شکوہ کچھ زمانے سے

وہ لمحہ ہی نہیں آیا کہ آنکھیں کھول سکتے ہم
حقیقت بھی ہوئی ہے خواب، خوابوں کو بسانے سے

کہاں جذبے بہم کرتے نہیں فرصت ملی ہم کو
تمہیں ہنسنے ہنسانے سے ہمیں رونے رلانے سے

گرے ہیں اشک مٹی میں، پڑی ہے خاک آنکھوں میں
ستاروں کی طرح ٹوٹے ہیں سپنے سب سہانے سے

نئی تعمیر میں اب کے نیا انداز اپناؤ
وگرنہ گھر نئے بھی ہوں تو لگتے ہیں پرانے سے

مرے دشمن کی باتوں کو مرے دشمن کی رہنے دو
تمہیں کیا لطف ملتا ہے مجھے سب کچھ بتانے سے



ایک تو زخم دل کا کاری ہے
اور پھر سانس ہے کہ آری ہے

مڑ کے دیکھو تو نقشِ پا بھی نہیں
بے نشاں زندگی ہماری ہے

اک سمندر ہے چاند کی زد میں
دل نے تصویر کیا اتاری ہے

نفرتوں میں تو یاد آئے گی
جو گھڑی پیار میں گزاری ہے

پیار کی جنگ میں نہیں ہوتا
کس نے جیتی ہے کس نے ہاری ہے

ہم تو اتنا سا جانتے ہیں بس
جس سے یاری ہے اس سے یاری ہے

دل کی دھڑکن سنائی دینے لگی
ہر طرف اک سکوت طاری ہے

عقل کو بھی نچا دیا اس نے
اپنا دل ہے کہ اک مداری ہے



دن بھی یہ کیسے ڈھل گیا' رات بھی سر پہ چھا گئی
جاگتے ہم کہاں تلک نیند بھی خود ہی آ گئی

وقت کہاں تھا بیٹھ کر' بارے میں اس کے سوچتے
خود ہی وہ شکلِ تند خو مَن میں مرے سما گئی

شامِ الم سے آشنا لمحے سبھی گزر گئے
پھر بھی پسِ غروبِ مہر ایک اداسی چھا گئی

نقش تھے اپنے ریت پر یا تھے وہ سطحِ آب پر
بادِ زمانہ کیا چلی سب کا لکھا مٹا گئی

کیسا یہ ایک کھیل ہے سب کو ہے کھیلنا جسے
موت ہے اس کو زندگی جس کی سمجھ میں آ گئی

سعدؔ وہ کیسے لوگ ہیں جن کو نہیں غرض کوئی
سوچ صبا کی مثل تھی دل کی کلی کھلا گئی



عمر بھر کا عذاب بھی دیکھو
کون کہتا تھا خواب بھی دیکھو

رنگ باقی ہے سوکھے پھولوں کا
کھول کر تم کتاب بھی دیکھو

دشت گردی ہے آبلہ پائی
دور تک اب سراب بھی دیکھو

ہم تمہیں خواب ہی تو کہتے تھے
اب کے اڑتا سحاب بھی دیکھو

آنکھ رکھتے ہو تم اگر تو پھر
دلِ خانہ خراب بھی دیکھو

تم ذرا آئنہ کرو مجھ کو
اور مرا انتخاب بھی دیکھو

جب بھی کھولو کبھی کتابِ حیات
تم محبت کا باب بھی دیکھو



مجھ پہ احسان مت جتاؤ تم
تم کو آنا ہے تو پھر آؤ تم

کس کی مرضی ہے فیصلہ کس کا
کیوں بہانہ کوئی بناؤ تم

شمع بن کر جلے گا پروانہ
جیسے چاہو اسے جلاؤ تم

آسمانوں میں جا گرے گی زمیں
دل کا دریا اگر بہاؤ تم

آؤ مثلِ صبا چلے آؤ
پھول ہی پھول اب کھلاؤ تم

لطف تب ہے کہ وسعتیں لے کر
میرے دامن میں گر سماؤ تم

چاند ہے سامنے سمندر کے
کوئی طوفان ہی اٹھاؤ تم

سعدؔ اب یاد مت کرو اس کو
سوئے فتنے کو مت جگاؤ تم



ہم کو خوش آیا ترا ہم سے خفا ہو جانا
سر بسر خواب کا تعبیر نما ہو جانا

چند اشکوں نے چھپایا ہے مکمل منظر
ہم پہ کُھلتا ہی گیا تیرا جدا ہونا

اپنی خواہش تری یادوں میں بھٹکتی ہے کہیں
جیسے گلگشت میں تتلی کا فنا ہو جانا

شاخ در شاخ سبک سار ہواؤں کا گزر
اک قفس سے کسی پنچھی کا رہا ہو جانا

اشک گرتے ہی کھلے پھول مرے دامن میں
رُت بدلتے ہی پرندوں کا صدا ہو جانا

ایک سائے کا ہے احساس مرے سر پہ سدا
کون سوچے گا کبھی خود سے خدا ہو جانا

آشنا ہم بھی محبت سے نہیں ہیں ہرگز
ہائے اس ربط کا بھی نذرِ اَنا ہو جانا



اپنی وفا کو اپنا لبادہ نہیں کیا
اظہارِ عشق ہم نے زیادہ نہیں کیا

ہم خار خار رستے سے گزرے لہو لہو
لیکن کسی کے نقش کو جادہ نہیں کیا

کچھ تو ہماری بات میں الجھاؤ تھا بہت
اسلوب اس نے اپنا بھی سادہ نہیں کیا

اس کی طرف اٹھے ہیں قدم بے ارادہ بھی
ہم نے حصولِ غم کا ارادہ نہیں کیا

ہم نے کیا جو عشق تو اک جرم ہی کیا
اور اس پہ جرم یہ کہ اعادہ نہیں کیا

ہم ابر کی طرح ہیں زمیں کی تلاش میں
ہم نے خیالِ جاں کو پیادہ نہیں کیا



کیف و مستی ہے اور سرور بھی ہے
اس میں حاضر مگر شعور بھی ہے

اشک میرے یونہی نہیں بہتے
اک خزانے کا یہ ظہور بھی ہے

جسم ڈھلتا ہے جب محبت میں
ایک خوشبو ہے اور نور بھی ہے

ایک پتھر بنا ہوا تھا دل
چوٹ پڑنے پہ چُور چُور بھی ہے

کب گراتی ہے پیڑ کو آندھی
اس میں شامل مرا غرور بھی ہے

میری مٹی کا کچھ قصور بھی ہے
آدمی آدمی سے دور بھی ہے

سعد سچ ہے کہ ظلم اس نے کیا
ظلم سہنا مرا قصور بھی ہے



اس کے سامنے صحرا تھا
میرے سامنے دریا تھا

پہلی کرن پر سورج کی
پہلا پنچھی چہکا تھا

تتلی تتلی اڑتے رنگ
پہلا پھول جو مہکا تھا

ہم بھی خواب میں رہتے تھے
ہم نے اس کو دیکھا تھا

کیسے چاندنی راتوں میں
تارا تارا بھیگا تھا

آج وہ رو بھی نہیں پایا
کل جو مجھ پر ہنستا تھا

دھوپ کا چاند بھی ہوتا ہے
میں نے کب یہ سوچا تھا

سعدؔ وہ کیسے زندہ رہا
اپنے لیے جو جیتا تھا



وہم تھا یا وہ دھوکہ تھا
میری آنکھ سے گزرا تھا

جاگتے میں بھی جاری ہے
خواب جو میں نے دیکھا تھا

کتنی دیر ٹھہرتا اور
وہ خوشبو کا جھونکا تھا

بہلاوا ہی کہہ لو اسے
میرا دل کب بہلا تھا

عشق تو سچ مچ کھیل نہیں
ہم نے بھی کبھی کھیلا تھا

ایک کھلونے کی صورت
جانے کیا کچھ ٹوٹا تھا

میری ہی محرومی نے
مجھ کو زندہ رکھا تھا

پیڑ تھے اپنی یادوں کے
بادل بادل سایہ تھا

سعد وہ کیسے دن تھے جب
ابر کے ساتھ میں اڑتا تھا



خشک پتوں کو خوب اڑاتی ہے
یوں ہوا جشن بھی مناتی ہے

کچھ نہیں ہاتھ کی لکیروں میں
آگہی راستے بناتی ہے

پھول کی پتیاں بکھرنے لگیں
اور ہوا ہی یہ گُل کھلاتی ہے

جتنا اڑتا ہوں آسماں کی طرف
یہ زمیں بوجھ بنتی جاتی ہے

۱۰۱ ——— دھوپ کا چاند

موت سے آگے کچھ نہیں معلوم
زندگی کب سمجھ میں آتی ہے

بن ہوا تو چراغ جلتے نہیں
اور ہوا ہی انہیں بجھاتی ہے

یہ ہوا دھوپ اوڑھ لے تو پھر
مجھ کو اندر سے بھی جلاتی ہے

سعدؔ اک جبر ہے ہوا میں بھی
یہ کبھی آندھیوں کو لاتی ہے



ایک لمحہ جو سانحاتی ہے
کون سمجھے کہ کائناتی ہے

آپ کیوں کوستے ہیں قسمت کو
یہ محبت تو حادثاتی ہے

کتنے رنگوں میں ہے ظہور اس کا
زندگی ساری وارداتی ہے

وہ کہ چھو کر بھی ایک خواب لگا
بے ثباتی سی بے ثباتی ہے

منحرف ہو رہے ہو کیوں خود سے
ساری تاریخ واقعاتی ہے

اک حقیقت چھپی ہوئی ہے کہیں
باقی سب کچھ توہماتی ہے

سعدؔ کیا پھر کرے وہاں کوئی
جہاں قسمت ہی ہار جاتی ہے



جب بھی بچپن کی یاد آتی ہے
چاند کی چاندنی ستاتی ہے

اشک آنکھوں میں تیر جاتے ہیں
سب کو کب شام راس آتی ہے

مجھ کو چھو کر ہوا پریشاں ہے
درد کی داستاں سناتی ہے

یہ سمندر کی بے بسی ہی تو ہے
جب ہوا ابر کو اٹھاتی ہے

مست چلتی ہے ساحلوں کی ہوا
بھیگے جسموں کو گدگداتی ہے

جب ہوا آندھیوں سے مل جائے
پھر تو یہ سیٹیاں بجاتی ہے

اک سحر پھوٹتی ہے پھر اس سے
رات شبنم میں جب نہاتی ہے

سعدؔ اتنی اڑان ٹھیک نہیں
یہ ہوا آگ بھی لگاتی ہے



وہ جو آنکھ میں ڈوبا تھا
جانے کتنا پیاسا تھا

خوشبو بن کر پھیلا وہ
کیسا صبا کا جھونکا تھا

ٹوٹے پھول درختوں سے
اک شاعر کا سپنا تھا

میرے پیار کا قصہ بھی
جیسے ایک بگولا تھا

پتھر کیسے ٹوٹا تھا
کیسے چشمہ پھوٹا تھا

امن کی راہ یہی تھی بس
وہ سچا میں جھوٹا تھا

زندگی کا آغاز تھا وہ
سعدؔ یہ دل جب دھڑکا تھا

ایک گلابی پھول تھا بس
اور کسی نے پھینکا تھا



جو آسمان سے ٹوٹا ہوا ستارا ہے
زمیں کی آنکھ میں آنسو کا استعارا ہے

پلٹ گیا ہے وہ دریا نشانیاں دے کر
شکستہ کشتی ہے، ٹوٹا ہوا کنارا ہے

میں ایک خواب سا لگتا ہوں خود کو چھو کر بھی
بہت قریب سے اس نے مجھے پکارا ہے

میں وحشتوں میں گھرا ہوں سمندروں کی طرح
کسی نے چاند کو پانی میں یوں اتارا ہے

نہ جانے کون سے لمحے جلا دے پیراہن
ہمارے چاروں طرف رقص میں شرارہ ہے

بگولے ناچتے پھرتے ہیں، ریت اڑتی ہے
ہماری آنکھ میں صحرا کا اک نظارا ہے

ہماری یاد سمندر کی موج ہے گویا
کہ جس نے ڈوبے سفینے کو پھر ابھارا ہے

اسے سنبھال کے رکھو، اسے گنوانا نہیں
یہ اشک سعدؔ مرا آخری سہارا ہے



ہر ایک بات اگرچہ کسی کی مانی بھی
مگر گماں سے ہے باہر وہ بدگمانی بھی

ہم اس سے بات نہ کر کے بہت پریشاں ہیں
ہمارے کام نہ آئی کوئی کہانی بھی

ہوائے نیم شبی نے سُلا دیا ہم کو
وگرنہ ہم نے سرِ دشت خاک چھانی بھی

پلٹ تو جاتے مگر دیر ہو گئی ہم کو
مٹائی وقت نے اپنی ہر اک نشانی بھی

زبان دے کے مکرنا بھی اس پہ ختم ہوا
وہ کیسے سنتا یہ سب کچھ مری زبانی بھی

ہمیں تو سعدؔ مکمل اداس رکھتی ہے
کہ ہم کو راس نہ آئی بھری جوانی بھی



اس کی محفل میں لیے دیدۂ تر جاتے ہیں
اور جلتے ہوئے پھرتا بہ سحر جاتے ہیں

لبِ خنداں ہو کہ ہوں ان کی شگفتہ آنکھیں
ہم سمجھتے تھے کہ یہ زخم بھی بھر جاتے ہیں

دیکھ لینا کہ یہی وقت نہ ہو چلنے کا
آپ کہتے ہیں تو پل بھر کو ٹھہر جاتے ہیں

رات کا خوف ہے، احساس ہے تنہائی کا
کب ترے کوچے سے یہ خاک بسر جاتے ہیں

ہم پریشانی میں چلتے ہیں انہی رستوں پر
وہی رستے جو کسی اور نگر جاتے ہیں

میں تہی دست ہوں اور بارہا یہ سوچتا ہوں
اس طرح لوگ کہاں لوٹ کے گھر جاتے ہیں

سعدؔ کچھ بھی ہو گزرنا ہے ہمیں وقت کے ساتھ
وقت رکتا ہے کہاں، سوچ کے ڈر جاتے ہیں



ڈوب جاتا ہے جب ستارا بھی
کام کرتا نہیں سہارا بھی

میں نہ کشتی کے رخ کو موڑ سکا
سامنے تھا مرے اشارہ بھی

آدمی کس قدر مکمل ہے
یہ سمندر بھی ہے کنارا بھی

ایک جنگل جلا تو سکتا ہے
ایک اڑتا ہوا شرارا بھی

کتنا تنہا ہے جو یہ کہتا ہے
کاش ہوتا کوئی ہمارا بھی

پاؤں رکتے نہیں ہیں روکے سے
لاکھ پیچھے سے وہ پکارا بھی

آؤ دیوار ہی سے ٹکرائیں
سعدؔ کوشش کریں دوبارہ بھی



میرے چاروں طرف حصار سا ہے
اور دل ہے کہ بے قرار سا ہے

رنگ کیسے بدل رہا ہے کوئی
پھر بھی مجھ کو اک اعتبار سا ہے

کچھ بھی مجھ کو نظر نہیں آتا
میرے دل میں کوئی غبار سا ہے

تیرا نشہ بھی دو گھڑی کا ہے
ٹوٹنے کو ابھی خمار سا ہے

جس میں نقشِ قدم نہیں ملتا
یہ محبت کا رہگزار سا ہے

اس پہ دو پھول ہی عقیدت کے
ایک اجڑا ہوا مزار سا ہے

ڈر رہا ہوں کہ جل نہ جاؤں کہیں
میرے اندر کوئی شرار سا ہے



دریا بھی سامنے تھا مکمل کٹاؤ پر
اور زندگی رواں تھی محبت کی ناؤ پر

کیسے زمیں کی قید سے کوئی نکل سکے
ہر سمت آسمان ہے پورے جھکاؤ پر

خواہش کسی کی کب ہے کہ وہ آگ میں جلے
ملتا کچھ اختیار تو اپنے چناؤ پر

لگتا ہے دل کے ہاتھوں ہی مجبور ہو گئے
سب کچھ لٹا گئے ہیں جو پہلے ہی داؤ پر

ہر زخم بھول جاتا ہے ہر بار کس طرح
لگتا ہے جب بھی گھاؤ نیا پہلے گھاؤ پر

اے سعدؔ جان بوجھ کے آئے ہو تم یہاں
کس نے کہا تھا آ کے یہاں تم جلاؤ 'پر'

نظمیں

صبح کا منظر

سرسراتے ہوئے آتی ہے درختوں سے ہوا
شاخ در شاخ لچکتا ہوا اک ساز چھڑا

دور دھرتی سے نکلتا ہوا سونے کا وہ تھال
وہ شفق رنگ میں ڈھلتا ہوا فطرت کا جمال

دونوں اطراف سڑک پر وہ سفیدے کے درخت
اور سحر بار مناظر کے سنورتے ہوئے بخت

شبنمی گھاس پہ سورج کی سنہری سی کرن
اور صبا مستی میں چھوتی ہوئی پھولوں کے بدن

صبح ہوتے ہی پرندے جو چہک اٹھتے ہیں
پھول ہی پھول ہر اک سمت مہک اٹھتے ہیں

یہ مناظر مرے جذبوں کو ہوا دیتے ہیں
آنکھ میں سوئے ہوئے خواب جگا دیتے ہیں

یہ کسی قاف کا لمحہ ہے جو خوابیدہ ہے
آنکھ کے ساتھ چمٹ کر بھی یہ نادیدہ ہے

آنکھ بھر کر کوئی منظر بھی اٹھایا نہ گیا
اور فطرت سے بھی یہ راز چھپایا نہ گیا

لوگ کہتے ہیں کہ حالات بدل جاتے ہیں
یہ مناظر بھی کسی وقت میں ڈھل جاتے ہیں

Exit

میری آنکھ کہ رستہ مانگے
لیکن کیسے؟
کوئی روزن اور نہ کھڑکی دیواروں میں
دیواروں پر آویزاں تصویریں
تصویروں پر رنگ خوشی کے ناچیں
ان کو دیکھ کے
میرے اندر آس امید کے پنچھی چہکیں

میرے من میں مہر محبت والے پھول بھی مہکیں
رنگوں کی اس آگ میں جلتے جذبے دہکیں
دیکھو صبح سے شام ہوئی
ایک تجلی عام ہوئی، اور کسی کے نام ہوئی
ایک حسیں سی رُت دل کا پیغام ہوئی
دیکھو شام سے رات ہوئی اور ہر اک رنگ کو مات ہوئی
دیکھو کب تک کوئی چاند میں تیرا چہرہ دیکھے
دیکھو کب تک تیرے آنچل پر کوئی تارے ٹانکے
کب تک کوئی باہر سے اس باغ کے اندر جھانکے
دیکھو کب تک کوئی بے منزل ہی چلتا جائے
کب تک کوئی راہ کی مٹی پھانکے
میری آنکھ کہ رستہ مانگے
لیکن کیسے؟
چوں چوں کرتی چڑیا

ایک درخت پہ چڑھتی چکیلی سی ایک گلہری
(دھوپ میں جس کا رنگ سنہری)
اونچے اونچے درختوں سے وہ گرتے پیلے پتے
اور پیروں کے نیچے روندے جانے والے سوکھے گیلے پتے
چھوٹے چھوٹے پروانوں کے پیچھے اڑتے پنچھی
ڈاروں سے بچھڑے اور ڈاروں کی جانب مڑتے پنچھی
تتلی کے پر جھاڑ کے کھاتی ہد ہد دیکھو
ہر اک منظر کو تم بے خود دیکھو
ایک ہوا کا جھونکا آیا
ان دیکھی اک خوشبو لایا
سب کچھ ایک ہُوا ہے اپنا اور پرایا
جھلمل جھلمل کرتے پیڑوں کے سائے
چھَن چھَن دھوپ بھی چھنتی آئے
دور کہیں اک کوئل اپنا میٹھا نغمہ گائے

سوچ میں یادوں کے رنگیں آنچل لہرائے
لیکن جس کو چھو کر دیکھو
وہ پتھر ہو جائے
کچھ بھی ہاتھ نہ آئے
وقت گزرتا جائے
لیکن دل کو کون بتائے
وہ تو اپنی چال پہ چلتا جائے
اور آخر پچھتائے
میری آنکھ کہ رستہ مانگے
لیکن کیسے؟

دل میں بس جاتے ہیں لوگ

کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو دل بھی توڑ جاتے ہیں
مگر پھر بھی ہمارے ساتھ ناتا جوڑ جاتے ہیں
اگرچہ وہ نہیں رُکتے ہیں روکے سے بھی اک پَل کو
ہمیشہ کے لیے لیکن وہ خوشبو چھوڑ جاتے ہیں

سچائی کی تلاش

زندگی خواب ہے اپنی تو پھر اس کی بھی حقیقت کیا ہے
خود کو چھو کر کبھی دیکھیں تو سہی اپنی مصیبت کیا ہے
اپنے مرنے کا تصور ہمیں جینے نہیں دیتا کیونکر
کچھ تو معلوم کریں اس کے سوا اور ودیعت کیا ہے

سوچ کے دھارے

مجھے کسی کی محبت نے زندگی بخشی
اندھیری رات میں جیسے دیا سا جلنے لگا
ہوا چلی تو کئی پیڑ سنسنانے لگے
ہر ایک جذبہ نیا پیرہن بدلنے لگا
ہر ایک سوچ میں چپکے سے کوئی دَر آیا
یہ دل تو دل تھا محبت سے خود ہی بھر آیا
مرے وجود میں آسیب تھا کوئی شاید
میں اپنے آپ سے خود ہی کلام کرنے لگا
پھر اس کے بعد ہوا کیا، نہیں ہے کچھ معلوم
جمالِ یار ان آنکھوں میں رنگ بھرنے لگا
خمارِ ذات مرے ذہن سے اترنے لگا

بھٹکتی آنکھ کو مرکز ملا تو ایسے لگا
کہ جیسے ایک مسافر پلٹ کے گھر آیا
ہر ایک خواب مری آنکھ میں اُتر آیا
جو زخم سینے کا میرے رسلا تو ایسے لگا
کہ شہد سے کوئی آنکھوں کو میری بھرنے لگا
یہ سوچ بھی تو بہت آشنا سی لگتی ہے
ہتھیلیاں کوئی آنکھوں پہ میری دھرنے لگا
میں اپنی بات بڑھاتا گیا خیالوں میں
ہر ایک لمحہ کسی یاد میں گزرنے لگا
بگڑ گیا تھا جو سب کچھ وہ پھر سنورنے لگا

میں گردشوں سے نکل کر کہاں تلک جاتا
کہ گردشوں میں تھا سب کچھ جہاں تلک جاتا
میں گردشوں کو بھی جیسے غلام کرنے لگا
حیات کو میں محبت کے نام کرنے لگا

مجھے کسی کی مروت نے جب اسیر کیا
تو آنکھ نے مرے دل کو مرا سفیر کیا
گزر گیا ہے وہ لمحہ تو اب میں سوچتا ہوں
کہ ہے عجیب سا سوچوں کا تانا بانا بھی
نہیں ہے بس میں ہمارے یہ آنا جانا بھی
نہ ہاتھ میں مرے ہونے کا کچھ بہانہ بھی
ہے ساتھ ساتھ یہ رونا بھی مسکرانا بھی
اسی ادا پہ ہے گردش میں یہ زمانہ بھی
ہوا کی زد میں رہا میرا آشیانہ بھی
مجھے کسی کی محبت نے زندگی بخشی

انکشاف

کیا روپ ہے اپنوں کا
ہر آنکھ پہ کھلتا ہے
جو رنگ ہے سپنوں کا

ردعمل

آج مجھ کو کہیں نہیں جانا
آج سونا ہے مجھ کو جی بھر کے
بند کر دو دریچے سب گھر کے
کھینچ دو پردے کھڑکیوں پر بھی
آج رونا ہے مجھ کو جی بھر کے
آج سونا ہے مجھ کو جی بھر کے
مجھ کو تنہائیوں میں رہنے دو
غم ملا ہے تو غم کو سہنے دو
اشک آنکھوں سے میری بہنے دو
مجھ کو اپنی طرح سے جینے دو

اپنے زخموں کو خود ہی سینے دو
اب مجھے جامِ درد پینے دو
دل بھی چاہے ہے تھوڑا ستا لے
کس کے بس میں کہ اس کو بہلا لے
اس کو اپنی ہی دھن میں رہنے دو
جو بھی کہنا ہے اس کو کہنے دو
آج مجھ کو کہیں نہیں جانا
آج رونا ہے مجھ کو جی بھر کے
آج سونا ہے مجھ کو جی بھر کے

ہوا

یہ ہوا جو کہ دل گداز بھی ہے
جب گزرتی ہے سبز پیڑوں سے
سرسراتا ہوا سا ساز بھی ہے
جھانکتی ہے کبھی یہ روزن سے
اس کے دم سے دریچہ باز بھی ہے
گُل بداموں کو گدگداتی ہے
یہ ہوا تو سراپا ناز بھی ہے

چھیڑتی ہے ہزار نغمے یہ
دل کو چھو لے تو دلگداز بھی ہے
ساتھ اس کے ہوا نہ ہو جانا
یہ بہانہ بھی ہے، جواز بھی ہے
یہ ہوا جلتی ہے چراغوں میں
یہ حقیقت بھی ہے، مجاز بھی ہے

یہ ہوا

کچھ نہ پوچھو ہوا قیامت ہے
اس کے ہر لمس میں صداقت ہے
جب کبھی یہ اثر دکھاتی ہے
اک عجب کیفیت جگاتی ہے
سوچ لمحوں میں اک عذاب بھی ہے
اس میں کانٹا بھی ہے گلاب بھی ہے
یہ دبے درد کو بڑھاتی ہے
چھا بھی جاتی ہے پھر حواس پہ یہ
جب کوئی یاد بن کے آتی ہے
میرے بالوں سے کھیلتی ہے یہ

اور مرا جسم گُدگُداتی ہے
میری پلکوں کو چھیڑتی ہے جب
میری نس نس کو یہ ہِلاتی ہے
ایک احساس کی طرح ہے یہ
جب مجھے دیر تک ستاتی ہے
رفتہ رفتہ یہ سوئے جذبوں میں
ایک طوفان سا اٹھاتی ہے
یہ ہوا آہ بھی تو بنتی ہے
اور پھر آگ سی لگاتی ہے
یہ مری بے بسی کو دیکھتی ہے
اور پھر خوب مسکراتی ہے

باغِ جناح کے پاس سے گزرتے ہوئے

چمپئی شام کے پہلو میں اداسی کا سماں
ہر طرف پھیلا ہوا جلتی امنگوں کا دھواں
ساتھ ہی باغ ہے اور باغ میں سبزہ ہر سُو
تتلیاں رنگ اٹھائے ہوئے پھرتی ہیں یہاں
چار موسم ہیں مگر ان سے الگ ہی برپا
ایک موسم کہ جہاں لوگ ہیں سڑکوں پہ رواں
لوگ بے چینی میں بھاگے ہی چلے جاتے ہیں
اک معمہ سا بنا جاتا ہے سارا یہ جہاں
دل یہ چاہے ہے کہ تھوڑا سا سکوں مل جائے
ایک لمحے کے لیے روح کو مل جائے اماں

دھوپ کا چاند

میری خواہش ہی نے برباد کیا ہے مجھ کو
ورنہ تو ایک ہی ہوتے تھے مکیں اور مکاں
ایسے لگتا ہے کہ خارج میں نہیں ہے کوئی
بے مروت کوئی لمحہ مرے اندر تھا نہاں
ورنہ امکان کی سرحد پہ کھڑا تھا میں بھی
کہ جہاں شکل بناتے ہیں سبھی وہم و گماں
چھپئی شام کے پہلو میں اداسی کا سماں
ایک آہٹ ہے کہ نزدیک چلی آتی ہے
اور کم ہوتی چلی جاتی ہے پھر آہ و فغاں

بہادر

یہی ہے اس میں منطق بھی
جو کرنا ہے وہ کرنا ہے
کہ جس رستے پہ چلنا ہے
اسی پر پاؤں دھرنا ہے
بہادر کا یہ شیوہ ہے
جسے دیوانگی کہہ لو
نہیں جینا جو عزت سے
تو پھر عزت سے مرنا ہے

ہم تو کچھ بھی نہیں ہیں

ہم نہ کسی کو ستانے والے
اور نہ دل کو دکھانے والے
پھر بھی ہم سے خفا رہتے ہیں
کیسے ہیں یہ زمانے والے
ہم ہیں پیار محبت والے
گیت خوشی کے گانے والے
اور اشعار سنانے والے
رونے اور رلانے والے
ہم کس گنتی میں آتے ہیں
اپنا درد چھپانے والے
ہم کو بخشیں زمانے والے

نئی امید

دل نے سوال جب کیا آنکھیں جواب ہو گئیں
دن کی سبھی حقیقتیں رات کو خواب ہو گئیں
پھر سے نئی امید میں ہم بھی چلے ہیں اس طرح
گو کہ ہماری منزلیں سعدؔ سراب ہو گئیں

حقیقت تو یہی ہے

مجھ پر ظلم ہوا تو کیا
کمزوروں پر ہوتا ہے
وہ جو کچھ نہیں کر پاتا
ہنستا ہے یا روتا ہے
جو پھر ظلم نہیں سہتا
وہ مظلوم نہیں رہتا

عورت

سچے پیار کا مظہر ہیں یہ عورت کے دو روپ
جلتے دن میں سایہ ہے وہ ٹھٹھرے دن میں دھوپ

قدم قدم قربانی ہے وہ قدم قدم ایثار
وہ آنکھوں سے چن لیتی ہے ہر اک راہ کے خار

وقت کے طاق میں رکھا دیا ہے اس کا اک اک پل
نسلِ نَو کا آج اسی سے اور اسی سے کل

روشنی، رنگ، ہوا اور خوشبو سب اس کی پہچان
وہ جو نہ ہو تو دنیا ساری ہو جائے ویران

صاحبزادہ خورشید گیلانی مرحوم کی یاد میں

مروت ہی مروت تھا' محبت ہی محبت تھا
تو اے خورشید گیلانی اخوّت ہی اخوّت تھا

خزاں آثار رُت میں بھی گُلِ تازہ کی صورت تھا
نقیبِ صبحِ نَو تھا تو' بہاروں کی بشارت تھا

تو قرطاس و قلم کی آبرو تھا شہرِ ظلمت میں
ترا ہر لفظ روشن تھا ترے خوں کی شہادت تھا

ترا باطن منوّر تھا' تجھے عرفانِ حق بھی تھا
ترا اظہار ہر پہلو صداقت ہی صداقت تھا

انحراف

وہ جو پھول ابھی کھلا نہیں مرے دل میں کیسے مہک گیا
وہ جو پنچھی ابھی اڑا نہیں سرِ شاخ کیسے چہک گیا
وہ جو درد ابھی ملا نہیں مرے من میں کیسے سما گیا
کوئی وہم سے مرے ذہن پر سبھی نقش کیسے بنا گیا

تبسم سحر پرور تھا طلسم آباد چہرے پر
تو ٹھنڈک تھا جو گرمی میں تو سردی میں تمازت تھا

ترے پیش نظر رہتی تھی یک جہتی اس امت کی
تو اس شیرازہ بندی میں نئے دن کی ضمانت تھا

اے خودداری کے پیکر تو متاعِ دلفگاراں تھا
مجسم بانکپن تھا تو اور اک کہسارِ عظمت تھا

رومانس کی حقیقت

کوئی دیکھے تو نئے روپ کا چاند
ایک برسے ہوئے بادل کی طرح
کتنا بے رنگ ہے یہ دھوپ کا چاند
کوئی بیتا ہوا اک پل جیسے

رات کے چاند کو اک مات ہوئی
صبح کو شام تو کرنا ہوگا
ساتھ اس کے نہ کوئی بات ہوئی
ہم کو زینے سے اترنا ہوگا

آنکھ اب دل کی طرف بہتی ہے
دل کی دل ہی میں رہی ہے اب تک
آہ کیا خلقِ خدا کہتی ہے
ہم نے ہر بات کہی ہے اب تک

طالبانِ حق

غم کا بوجھ اٹھانے والے
درد سے دل بہلانے والے
زندہ ہیں یہ لوگ ابھی تک
جاگنے اور جگانے والے

حق پر ہیں اور کتنے نڈر ہیں
موت و حیات سے بالاتر ہیں
خونی آندھی میں بھی کھڑے ہیں
باطل سے ٹکرانے والے
زندہ ہیں یہ لوگ ابھی تک
جاگنے اور جگانے والے

وہ ہیں جذبہ ایمانی میں
دنیا ہے اک حیرانی میں
کیسے ہیں یہ دیوانے سے
ہر لالچ ٹھکرانے والے
زندہ ہیں یہ لوگ ابھی تک
جاگنے اور جگانے والے

ان کے ارادے چٹانوں جیسے
عشق میں وہ پروانوں جیسے
وہ ہیں سود و زیاں سے آگے
حق پر سَر کو کٹانے والے
زندہ ہیں یہ لوگ ابھی تک
جاگنے اور جگانے والے

پیکرِ عزم و ہمت ہیں وہ
سب سے بڑی صداقت ہیں وہ
کوئی حرص و ہوس نہیں ان کو
یہ ہیں شمع جلانے والے
زندہ ہیں یہ لوگ ابھی تک
جاگنے اور جگانے والے

کتنے بے سر و ساماں ہیں وہ
لیکن اہلِ ایماں ہیں وہ
ہر حالت میں صابر و شاکر
یہ ایمان بچانے والے
زندہ ہیں یہ لوگ ابھی تک
جاگنے اور جگانے والے

ان کا درد نہ جانے کوئی
کاش ان کو پہچانے کوئی
وہ اک اور ہی دنیا میں ہیں
کیا سمجھیں سمجھانے والے
زندہ ہیں یہ لوگ ابھی تک
جاگنے اور جگانے والے

غیرت کا دَم بھرنے والے
اپنے دین پہ مرنے والے
اب تو خود بھی ڈرنے لگے ہیں
ان کو روز ڈرانے والے
زندہ ہیں یہ لوگ ابھی تک
جاگنے اور جگانے والے

٢

مصلحت پسند لوگوں سے

آنکھ میں خواب بسانے والے
اور تعبیر بتانے والے
زندگی ہی میں مر جاتے ہیں
ڈرنے اور ڈرانے والے

خود سے آنکھ چراتے ہیں وہ
لڑنے سے گھبراتے ہیں وہ
پل پل ان کو تڑپاتے ہیں
کتنے زخم پرانے والے
زندگی ہی میں مر جاتے ہیں
ڈرنے اور ڈرانے والے

کیسے چہروں پر ہیں چہرے
کوئی ان کی ذات تو پوچھے
دیکھ رہے ہیں ان کی صورت
آنے والے جانے والے
زندگی ہی میں مر جاتے ہیں
ڈرنے اور ڈرانے والے

کب تک وقت گزاریں گے یہ
اپنے پاؤں پساریں گے یہ
خود کو دھوکہ کیوں دیتے ہیں
سچ سے آنکھ چرانے والے
زندگی ہی میں مر جاتے ہیں
ڈرنے اور ڈرانے والے

دیکھو یہ نادان ہیں شاید
ان کے کچھ ارمان ہیں شاید
دیکھو کب تک بیٹھتے ہیں یہ
اپنے گھر کو بچانے والے
زندگی ہی میں مر جاتے ہیں
ڈرنے اور ڈرانے والے

ہوش میں ان کو آنا ہوگا
پاکستان بچانا ہوگا
آنکھیں کھول کے دیکھیں اب تو
سوچیں سر کو جھکانے والے
زندگی ہی میں مر جاتے ہیں
ڈرنے اور ڈرانے والے

آؤ اپنی نشانی دے دیں
زندہ رہیں، قربانی دے دیں
زندہ اور پائندہ ہیں وہ
حق پر جان سے جانے والے
زندگی ہی میں مر جاتے ہیں
ڈرنے اور ڈرانے والے

آؤ دین کے طالب دیکھو
حق ہے جن پر غالب دیکھو
بہت ہی گہرے ہوتے ہیں یہ
سیپ سے موتی پانے والے
یہ ہیں عَلَم اٹھانے والے
باطل سے ٹکرانے والے

حقیقت

ہر شخص کہانی ہے
جو دوجے کو سننی ہے
اور اس کو سنانی ہے

آنسو

اس آنسو میں جو دیکھو تو
وہ خاصیت بھی ہوتی ہے
نہ برسے تو یہ بادل ہے
جو برسے تو یہ موتی ہے